مولانا زاہد الراشدی

شیعہ سنی تصادم روکنے کی ضرورت اور تقاضے

مشرقِ وسطیٰ ہو یا پاکستان، ہم کسی بھی جگہ سنی شیعہ کشیدگی میں اضافہ اور اس کے فروغ کے حق میں نہیں ہیں اور پہلے کی طرح اب بھی دل سے چاہتے ہیں کہ اس کی شدت اور سنگینی میں کمی لائی جائے اور اس ماحول کو بحال کرنے کی کوشش کی جائے جو سنی شیعہ کشیدگی کے باقاعدہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کرنے سے قبل موجود تھا کہ باہمی اختلافات کے باوجود مشترکہ قومی مسائل میں ایک دوسرے سے تعاون کیا جاتا تھا۔ اختلافات کو دلیل اور مناظرے کے دائرے میں محدود رکھا جاتا تھا، ایک دوسرے کے عقیدہ و موقف پر شدید تنقید بھی کچھ حدود کا لحاظ رکھتی تھی اور باہمی قتل وقتال اور تصادم سے ہر ممکن گریز کیا جاتا تھا۔ ہم نے پاکستان کے قیام کی تحریک سے لے کر تحریک ختم نبوت صلی اللہ علیہ وسلم، تحریک نظام مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم، تحریک تحفظ ناموس رسالت صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر دینی وقومی تحریکات میں مشترکہ کردار ادا کیا ہے۔ اور ان تمام تر اختلافات کے باوجود کیا ہے، جنھوں نے اب ہمیں ایک دوسرے کے خون کا پیاسا بنا رکھا ہے۔ اور سنی شیعہ اختلافات کا جملہ زبان پر آتے ہی دل و دماغ میں عجیب سے ہیجان بپا ہونے لگتا ہے۔ جہاں تک اختلافات کی بات ہے وہ تو صدیوں سے چلے آ رہے ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔ انھیں ختم نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی دونوں میں سے کوئی گروہ دوسرے کو ختم یا مغلوب کر سکتا ہے۔ یہ اختلاف عقیدہ میں بھی ہے شخصیات میں بھی ہے، فقہ وشریعت میں بھی ہے اور رسوم وعبادات میں بھی ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ اختلافات کسی طرح ختم کیے جا سکتے ہیں تو وہ انسانی فطرت، معاشرتی، نفسیاتی اور تاریخی پس منظر وعوامل سے بے خبری کا اظہار کرتا ہے۔ البتہ ان اختلافات کا ایسا اظہار اور ان کی بنیاد پر ایسا باہمی رویہ ضرور غور طلب ہے جو کشیدگی میں اضافے کا باعث بنتا ہے اور باہمی تصادم کی راہ ہموار کرتا ہے۔ اس کا سنجیدگی سے جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ ہم اس پر غور وخوض کی اہل فکر ودانش کو وقتاً فوقتاً دعوت دیتے رہتے ہیں اور اسے اپنی دینی وقومی ذمہ داری سمجھتے ہیں۔

دراصل ہمارے ہاں یہ سوچ مسلسل پروان چڑھ رہی ہے کہ کسی مسئلے کو ''کیموفلاج'' کر دینے سے شاید اس کے حل کی کوئی صورت نکل آتی ہے۔ یعنی مسئلے کے وجود سے انکار کر دیا جائے۔ اس پر بحث وتمحیص سے گریز کیا جائے اور اسے نظر انداز کیا جاتا رہے تو وقتی طور پر وہ آنکھوں سے ضرور اوجھل ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کی سطح سمندر جیسی خاموشی کی تہہ میں جو طوفان کروٹیں لے رہے ہوتے ہیں، ان میں ایک بھی ابھر آئے تو سب کچھ تہ وبالا ہو کر رہ جاتا ہے اور پھر جو کچھ کیا جا سکتا ہے وہ بھی نہیں ہو پاتا۔

پاکستان کا داخلی ماحول ہو یا مشرق وسطیٰ کا وسیع تناظر ہو ہم ہر جگہ اور ہر حوالے سے اس بات پر زور دیتے آ رہے ہیں کہ کشیدگی کی موجودگی کو محسوس کیا جائے، اس کے معروضی تناظر کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جائے اس کے اسباب

وعوامل کی نشاندہی کی جائے، فریقین کے سنجیدہ اربابِ دانش کے درمیان مکالمے کا اہتمام کیا جائے۔ ان اسباب وعوامل کو کم کرنے کے امکانات کا جائزہ لیا جائے۔ ایک دوسرے کے وجود اور جائز حقوق کا احترام کیا جائے اور ایک دوسرے کی شکایات وتحفظات کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ یہ کام یک طرفہ نہیں بلکہ دوطرفہ بنیادوں پر ہونا چاہیے اور ایسے موثر افراد وطبقات کو سامنے آنا چاہیے، جو عدل وانصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دونوں فریقوں سے بات کر سکیں۔ دونوں کو ایک میز پر لا سکیں، حقیقت پسندانہ توازن قائم کر سکیں اور معاملات کو سلجھانے یا کم از کم مزید بگڑنے سے روکنے کے لیے کوئی کردار ادا کر سکیں۔

ہمارے خیال میں مسئلے کا اصل یہی ہے اور اس کے لیے مشرقِ وسطیٰ کے ماحول میں اسلامی سربراہ کانفرنس کی تنظیم، جبکہ پاکستان کے اندر عدالت عظمیٰ یا ریٹائرڈ جسٹس صاحبان کا کوئی فورم اس کام کو بطریق احسن سرانجام دے سکتا ہے۔ اگر حکومتی سطح پر یا فریقین کی طرف سے اس کی پذیرائی نہ ہو تو بھی غیر جانبدار دانشوروں کا کوئی فورم اپنے طور پر یہ ذمہ داری قبول کر کے آزادانہ انکوائری اور تحقیقات کے ذریعے شیعہ سنی کشیدگی میں مسلسل اضافے کے اسباب وعوامل کی نشاندہی کر کے اس میں کمی لانے کے لیے تجاویز اور سفارشات ملکی اور عالمی رائے عامہ کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ اس سے لوگوں کو اصل صورت حال سمجھنے میں مدد ملے گی اور رائے عامہ کی راہ نمائی ہو جائے گی۔ اور یہ طرزِ عمل کوئی نئی اور ان ہونی بات نہیں ہوگی، کیونکہ قومی اور عالمی سطح پر تنازعات میں ایسا ہوتا آ رہا ہے اور اس کی افادیت اور تاثیر سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

مثلاً مشرق وسطیٰ کی موجودہ صورت حال کو سعودی عرب اور ایران کے درمیان پراکسی وار سے تعبیر کیا جا رہا ہے۔ اور ظاہری تناظر بھی یہی ہے کہ مشرق وسطیٰ کے نصف درجن کے لگ بھگ ممالک میں یہ کشیدگی آگے بڑھ رہی ہے اور اس کشیدگی کے فروغ کی پشت پر ایران اور سعودی عرب کی موجودگی ہر ایک کو نظر آ رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا موقف یہی ہوگا کہ وہ یہ سب کچھ اپنے دفاع میں کر رہا ہے اور اپنے ہم خیال لوگوں کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اپنی سلامتی اور بقا کی خاطر اسے ایسا کرنا پڑ رہا ہے۔ لیکن کیا ان دعووں کا زمینی حقائق کی بنیاد پر جائزہ لینا ضروری نہیں ہے؟ سوال یہ ہے کہ زمینی حقائق کیا ہیں، واقعات کی ترتیب کیا ہے اور ایک دوسرے کے حوالے سے اقدامات اور پالیسیوں میں توازن وتناسب کیا ہے؟ جب تک ان امور کا جائزہ نہیں لیا جائے گا اور معروضی صورت حال کی پشت پر کارفرما حقائق واسباب کو سامنے نہیں لایا جائے گا، نہ تو اس کشیدگی بلکہ تصادم کو روکنا ممکن ہوگا اور نہ ہی انصاف کے تقاضے پورے کیے جا سکیں گے۔ دونوں میں سے کسی کو یہ سمجھانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس کشیدگی اور تصادم کا فائدہ صرف امریکا، اسرائیل اور ان عالمی قوتوں کو ہے جو عالم اسلام کو بکھری ہوئی حالت میں رکھنا چاہتی ہیں، جنھیں عالم اسلام میں دینی بیداری اور مذہبی رجحانات کا فروغ برداشت نہیں ہے جن کا مفاد اسرائیل کے تحفظ واستحکام اور اس کے ذریعے مشرق وسطیٰ کے وسائل اور دولت پر اپنی گرفت قائم رکھنے

میں ہے اور جو عالم اسلام کو اس کے اپنے وسائل کے کنٹرول اور استعمال سے محروم رکھنے میں اپنی عافیت سمجھ رہی ہیں۔

لیکن اس کے لیے سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ حالات کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں، اسباب وعوامل کا تعین کریں اور انھیں دور کرنے کے لیے باہمی مکالمہ ومشاورت کے ساتھ راستہ نکالیں۔ ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم سب نے مسائل کے حل کے لیے امریکا کی طرف دیکھنے کی روش اپنالی ہے۔ ہماری اپنی پالیسیوں کا تعین بھی واشنگٹن کا موڈ دیکھ کر ہوتا ہے اور اسے دولت وطاقت کا کرشمہ ہی کہا جاسکتا ہے کہ امریکا بہادر بیک وقت حریف بھی ہے، فریق بھی ہے، ریفری بھی ہے، قابض بھی ہے، جج بھی ہے گواہ بھی ہے وکیل بھی ہے اور فیصلہ صادر کرنے کے بعد سزا دینے کی اتھارٹی بھی وہی رکھتا ہے۔ کیا عالم اسلام کی مثال آپریشن تھیٹر کے اس مریض کی تو نہیں جسے سرجن نے بے ہوش کر کے اس کے پورے جسم کی چیر پھاڑ شروع کی رکھی ہے؟ بات آپریشن کی حد تک رہتی تو کسی حد تک قابل فہم تھی، مگر اب تو یہ آپریشن ''پوسٹ مارٹم'' کی صورت اختیار کرتا جارہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارے حال پر رحم فرمائیں، آمین یارب العالمین۔

نوٹ: یہ کالم تین چار روز قبل لکھ کر مکمل کر چکا تھا اور ارادہ تھا کہ ستمبر کا پہلا عشرہ گزر جانے کے بعد اسے اشاعت کے لیے بھجواؤں گا۔ مگر اس کے بعد دو بظاہر چھوٹی سی خبریں نظر سے گزریں۔ جن کو کسی تبصرہ کے بغیر قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہوسکتا ہے دوستوں کو ہماری گزارشات کا مقصد سمجھنے میں اس سے کچھ سہولت ہو جائے۔ ایک خبر ایک قومی روزنامے کے ملتان ایڈیشن میں ۵ ستمبر کو شائع ہوئی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ:

''ایران کے قونصل جنرل نے حال ہی میں حکومت پنجاب کی اعلیٰ شخصیات سے ملاقات کر کے انھیں پیش کش کی تھی کہ پنجاب پولیس اور ایران پولیس ایک دوسرے کے تجربات سے فائدہ اٹھائیں تاکہ دہشت گردی کے خاتمے کے لیے پولیس کو جدید خطوط پر تربیت دی جاسکے۔ ذرائع کے مطابق حکومت پنجاب نے یہ پیش کش قبول کر لی ہے اور فیصلہ کیا ہے کہ سیکرٹری داخلہ پنجاب، آئی جی پولیس پنجاب اور ایڈیشنل آئی جی اسپیشل پر مشتمل ایک وفد تین روز دورے پر ایران جائے گا اور ایران کے پولیس سسٹم کا جائزہ لے گا۔''

جبکہ دوسری خبر ایک اور معاصر کے گوجرانوالہ ایڈیشن نے ۸ ستمبر کو شائع کی ہے جس کا متن یہ ہے: ''امریکی اخبار ''واشنگٹن ٹائمز'' نے اپنی رپورٹ میں دعویٰ کیا ہے کہ یمن، شام، لبنان اور غزہ کی پٹی میں ایران اپنے حامی جنگجوؤں کو سالانہ اربوں ڈالر کی امداد مہیا کرتا ہے۔ رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ایران کی وزارت دفاع کا سالانہ بجٹ ۱۴ سے ۳۰ ارب ڈالر کے درمیان ہے، جس کا ایک بڑا حصہ بیرون ملک مسلح دہشت گرد گروہوں بالخصوص مشرق وسطیٰ میں سرگرم تنظیموں کو پہنچایا جاتا ہے۔ شام میں بشار الاسد کی حمایت میں لڑنے والے اجرتی قاتلوں کو ماہانہ ۵۵۰ سے ایک ہزار ڈالر اجرت ایران کی طرف سے ادا کی جاتی ہے۔ ان میں سے بیشتر جنگجوؤں کا تعلق افغانستان اور دوسرے ملکوں سے ہے، پہلے ان کی ایران ہی میں عسکری تربیت کی جاتی ہے''۔